اقبال کا نظریۂ ادب — ایک تقابلی جائزہ

محمد عثمان رمز

اقبال کے کلام اور فلسفہ کی نت نئی تعبیریں اور نت نئی تشریحات کی گئی ہیں۔ نہ ان میں سے سب صحیح ہیں اور نہ ہی سب غلط ہیں۔ پھر بھی بعض خیالات کا اظہار انتہائی درجہ تعجب خیز ہے۔ ایک بزرگ نے اقبال کے نظریۂ ادب پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''پھر بھی اقبال کے نظریۂ ادب کو انکے فلسفۂ خودی سے کوئی واسطہ نہیں''۔ انکی اس جرأت رندانہ کو دیکھ کر بیساختہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار ذہن میں آگئے :—

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں انکی گرہ میں تمام یک دانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اقبال کے نظریۂ ادب کو ''خودی'' سے واسطہ ہے یا نہیں اسکا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں۔ میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ اقبال کے ادب اور فلسفہ دونوں کا مرکز و محور ''خودی'' ہے، اس لئے کہ اقبال نے اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ یہی وہ مشعل حیات ہے جو زندگی کی صحیح رہنما بن سکتی ہے۔

ہم اگر اقبال کے دور پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ حقیقت ہم پر واضح ہو جائیگی کہ پہلی جنگ عظیم نے دوسری جنگ عظیم کی بنا ڈالدی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس جیسی جابر و قاہر سامراجی طاقتیں اپنے سنگھاسن کو برقرار رکھنے کی سکت سے محروم ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے دو اور نئی طاقتیں نمودار ہو رہی تھیں جو پہلی دو طاقتوں سے اپنے مکر و فریب کے لحاظ سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ اقبال کی دور رس

نگاهیں ان سامراجی طاقتوں کے کھیل اور اسکے نتائج کو بھانپ چکی تھیں ۔ ان زوال پذیر یا ابھرتی ہوئی طاقتوں سے اقبال کو کوئی بہت بڑا خدشہ لاحق نہ تھا ۔ بلکہ جو چیز انکی پریشانیوں کا باعث تھی وہ اس برصغیر کے عوام کی اخلاق زبوں حالی تھی ۔ نیز عالم اسلام کی پراگندگی بھی انکے دردمند دل میں کھٹک پیدا کر چکی تھی ۔ اقبال نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کا بالفعل آزاد ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔ اور اسی طرح عالم اسلام کا بیدار ہوجانا بیسویں صدی کا ایک بڑا معجزہ ہوگا ۔ کیوں؟ آخر یہ بدگمانی کیوں ؟ اسکا جواب بہت ہی سیدھا سادہ ہے ۔ اقبال یہ محسوس کر رہے تھے کہ عالم اسلام سے اگر سامراجی طاقتیں پوریا بستر لپیٹ کر رخصت بھی ہو جائیں تب بھی انکی درآمد کردہ لادینیت، سرمایہ داری، نام نہاد جمہوریت، مادیت اور تہذیب و ثقافت، عالم اسلام کے معاشرہ کو، ہر ملک میں، دو حصوں میں منقسم کر دینگی ۔ عالم اسلامی کے ہر ایک معاشرہ میں ایک طبقہ وہ ہوگا جو سامراجی طاقتوں کا نمائندہ اور خلیفہ ہوگا اور دوسرا طبقہ وہ ہوگا جو خلیفۃ اللہ فی الارض اور اسلامی نظام کے احیاء کا علمبردار ہوگا ۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر ملک اور معاشرہ میں سامراجی طاقتوں کی رخصت کے بعد ایک خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو جائیگی ۔ اور آج پورے عالم اسلامی میں یہی دردناک منظر پیش نظر ہے ۔

اسی تمدنی بحران کو روکنے اور اس پر بندھ باندھنے کیلئے اقبال نے فلسفہ اور ادب میں اس کٹھن کام کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا جس کیلئے ہر قوم بے چینی سے ایک ''مرد حر،، کا انتظار کرتی ہے ۔ انہوں نے مسلمانوں کی بیداری کیلئے تجدید افکار کا بیڑا اٹھایا ۔ اور اپنے تجدیدی کارناموں کی بنیاد فلسفۂ خودی پر رکھی ۔ ان کی تخلیقات میں ''خودی،، کا تصور بہت ہی وسیع اور ہمہ گیر ہے ۔ اسکو لیبنیز (Leibnitz) کے موناڈ (Monad) برگسان (Bergson) کے ایلان ویٹل (Elan Vital) یا نیٹشے (Nietzsche) کے فوق البشر وغیرہ جیسے تصورات سے نسبت دینا تسکین نفس کا ذریعہ تو ہوسکتا ہے لیکن اس فعل کو حقیقت کلیہ پر مبنی کہنا ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا ۔ اقبال کا فلسفہ خودی نظریاتی ہے اور اس میں ناقابل تردید آہنگ بھی پائی جاتی ہے ۔ انکے فلسفہ خودی کے متنوع پہلو ہیں جن میں دینی، ما بعد الطبیعی، سماجی اور نفسیاتی پہلو بہت نمایاں ہیں ۔ ''خودی،، کے مسئلہ پر انہوں نے جہاں جہاں اظہار خیال کیا ہے ان میں ایک طرح کی وحدت پائی جاتی ہے ۔ کہیں تناقض یا تضاد کا گزر نہیں ۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے بنیادی مفروضہ ('Hypothesis) کو بڑے سائنٹیفک انداز میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ حیرت ہے کہ اتنی مربوط اور مرکزی بنیاد کو فلسفہ' ادب سے کیونکر خارج از بحث یا غیر متعلق سمجھا جاسکتا ہے۔

اقبال کے نظریہ' ادب کا فلسفہ' خودی [1] اور خود فلسفہ' خودی کا نظریہ' ادب سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے اقبال کے نظریہ' ادب کی افہام و تفہیم کیلئے ''خودی،، کے تصور کا ادراک ضروری ہے۔ ''خودی، جبر و قدر اور حیات بعد الموت،، کے عنوان سے تشکیل جدید الہیات اسلامیہ میں جو لکچر مرقوم ہے اسی کو اگر ہم غور سے پڑھیں تو ہمیں اس موضوع پر ایک بصیرت افروز بحث ملیگی۔ اس لکچر کی ابتدا' میں اقبال نے خودی کے تین دینی اجزائے ترکیبی کا واشگاف الفاظ میں اعادہ کیا ہے۔ پہلا جزو یہ ہے کہ ''انسان اللہ تعالی کا برگزیدہ ہے،،۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ ''باوجود اپنی خامیوں کے وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے،،۔ اور تیسرا جزو یہ ہے کہ ''وہ ایک آزاد شخصیت کا امین ہے جسے اسنے خود اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر قبول کیا ہے،،[2] مابعد الطبیعی نقطہ' نظر سے ''خودی،، حواس خمسہ کی گرفت سے بالاتر ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ''خودی،، — ہر انفرادی خودی — ''حقیقت مطلق،، کا جزو اور اسکی آئینہ دار ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے ہر منفرد ''خودی ،، علم، جذبات اور عمل کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ہے۔ سماجی لحاظ سے ''خودی،، تنازع للبقاء کی بجائے توافق للبقاء کی طرف مائل ہے۔ جسکا مطلب یہ ہوا کہ ''خودی،، اور ''خودی،، کا ٹکراؤ مقصادی ہونا چاہئے نہ کہ سشینی۔ اس نکتہ کی تفصیلی شرح اس مقالے کا موضوع نہیں ہے پھر بھی اتنی بات ضرور عرض کروں گا کہ انسانی معاشرہ میں ٹکراؤ اور تصادم، جنگ و جدل اور کشت و خون کے جذبات فطرت ثانیہ کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ان جذبات کو ڈاروِن کے نظریہ' تنازع للبقاء اور نیٹشے کے Blood-Beast کے تصور نے اور بھی ہوا دی جسکے نتیجہ میں امن عالم غارت ہوچکا ہے۔ اور آئندہ بھی اسکی بحالی کے امکان کم ہی نظر آتے ہیں۔ اقبال جو انسانی برادری سے غایت درجہ محبت رکھتے تھے انہوں نے انیسویں اور بیسویں صدیوں کے ان انتشار افزا تصورات

---

1 اپنی تصنیف ''نئے پرانے چراغ،، میں آل احمد سرور رقمطراز ہیں کہ ''اقبال کا آرٹ اسکے فلسفہ' خودی کے تابع ہے،،۔ صفحہ نمبر ۲۰۷

2 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ از ڈاکٹر اقبال۔ صفحہ نمبر ۱۴۱ تا ۱۴۳

کے رخ سے نقاب پلٹ دی جنہوں نے عالمگیر فضاء کو مسموم کر رکھا تھا۔ تنازع للبقاء اور Blood-Beast کے تصورات ان میں شامل ہیں۔ اقبال یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ انسان جو پیکر عمل ہے بھلا کب چین سے بیٹھ سکتا ہے۔ انسان اور انسان میں کشمکش ہوگی، انسان اور نظام قدرت میں کشمکش ہوگی۔ انہوں نے اپنے ادب اور فلسفہ میں اس امر کی سعی بلیغ کی ہے کہ انسان کی توجہ آدمی اور آدمی کی کشمکش سے ہٹا کر آدمی اور نظام قدرت کی کشمکش کی طرف مبذول کرادیں۔ اسی لئے یہ اختلاف انداز بیان وہ اپنی ہر تخلیق میں ''مہ و انجم،، پر ''دام افگنی،، کے جذبات کو ابھارنے اور انکو اپنے زور بیان سے تقویت پہنچاتے ہیں۔

یہ ہے ''خودی،، کی کیفیت اور کمیت۔ ادب اگر خودی کا محافظ ہے تو پھر ادب کا دائرہ کیونکر ''خودی،، کے دائرے سے کم تر ہوسکتا ہے۔ محافظ اسی وقت کسی شے کی حفاظت کر سکتا ہے جبکہ اسمیں حفاظت کرنے کی صلاحتیں اور طاقتیں بدرجہ' اولیٰ موجود ہوں۔ اقبال نے اس اشکال کا ازالہ خود ہی کردیا ہے۔ انکی متنوع تخلیقات کو دیکھنے کے بعد کسی کے ذہن میں لمحہ بھر کیلئے بھی یہ شبہ پیدا نہیں ہوسکتا کہ ادب ''خودی،، کی حفاظت کرنے سے عاجز اور مجبور ہے۔ اقبال نے اپنی تخلیقات میں یہ ثابت کردیا ہے کہ ''خودی،، زندگی کے ہم معنی ہے اور ادب زندگی کا بہترین محافظ بن سکتا ہے۔ ادب کی گہرائی خودی اور زندگی کی وسعتوں سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ ادب کی روح رواں ''خودی،، ہے اور ''خودی،، ایک مقصدی اکائی ہے۔ اس لئے ہر وہ ادب بھی مقصدی ہے جسکی بنیاد '' خودی،، پر استوار ہوتی ہو۔

اتنی باتوں کے باوجود یہ موضوع تشنہ سا معلوم ہو رہا ہے۔ اس تشنگی کو بجھانے کیلئے ہمیں اقبال ہی کیطرف رجوع کرنا چاہئے۔ اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق تخلیق ''اسرار و رموز،، میں ایک باب بہ عنوان ''درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ،، اس بحث کی رہنمائی کیلئے وقف کردیا ہے۔ یہ باب ہشتم ہے۔ اسکے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اقبال نے ادب کی حقیقت بیان فرمائی ہے اور ادیبوں کے اوصاف بھی۔ دوسرے حصہ میں سڑے گلے ادب پر تنقید کی ہے۔ تیسرے حصہ میں نقاظ اور جھوٹے شاعروں اور ادیبوں کے رخ سے پردہ ہٹایا ہے اور آخری حصہ میں عامۃ الناس سے اپیل کی ہے کہ وہ زندگی سے فرار اور گریز سکھانے والے شعراء اور ادیبوں کی تخلیقات

ہیے اجتناب کریں - دیکھا جائے تو یہ باب اقبال کے نظریہ' ادب کے مثبت اور منفی — دونوں پہلوؤں — پر حاوی ہے - اور وہ لوگ جو اقبال کو اقبال کے کلام کے ذریعہ سمجھنا چاہتے ہیں انکے لئے خاصہ مواد فراہم کرتا ہے - آئیے اس باب کا ایک اجمالی تجزیہ کرکے دیکھیں - ابتدا میں چند اشعار ''آرزو،، سے متعلق نظم کئے گئے ہیں - اقبال کی ''آرزو،، ہمارے کلاسیکل شعراء کی آرزو سے کوئی نسبت نہیں رکھتی، اس لئے کہ انکے کلام میں نہ تو کوچہ گردی کی آرزو ہے، نہ ہی اس بیوفا اور ستمگر سے ملنے کی آرزو ہے جو عاشق کے ''شکن بستر،، بننے کے بعد بھی اسکو دیکھنے نہیں آتا، نہ ہی انہیں کبوتر پالنے کی آرزو ہے جو پیامی کا فریضہ انجام دے سکے - اقبال کی آرزو کا سیدھا سادہ مطلب ''حرکت،، ،''ولولہ،، اور ''داعیہ' عمل،، ہے - اسی آرزو کو شراب اور زندگی کو اقبال جام سے تشبیہہ دیتے ہیں - ظاہر ہے کہ خالی خولی جام کی وقعت ہی کیا ! اسی طرح اس زندگی کی قدر و قیمت کیا جو ''آرزو،، سے خالی ہو - پھر اقبال کہتے ہیں کہ مقصد زندگی تسخیر کائنات ہے لیکن تسخیر کا داعیہ پیدا کہاں سے ہوتا ہے ؟ آرزو سے - یہی وہ ''دام،، ہے جس سے مہہ و انجم شکار کئے جاسکتے ہیں - اب شعر ملاحظہ فرمائیے : —

گرم خون انساں ز داغ آرزو
آتش ایں خاک از چراغ آرزو
از تمنا مے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمون تسخیر است وبس
آرزو افسوس تسخیر است وبس

یہ آرزو کیا ہے ؟ اسی ''خودی،، کا ایک نفسیاتی داعیہ عمل - ''آرزو،، اگر نہ ہو تو خودی ساکت و جامد اکائی سے زیادہ کچھ بھی نہیں - اور اگر خودی جمود و خمود کا پیکر ہو تو پھر ادب کی تخلیق کا کیا سوال ؟ لہذا یہ کہنے میں باک نہیں کہ جسطرح ''خودی،، جان زندگی ہے اسی طرح ''آرزو،، جان خودی ہے - ''آرزو،، ہو تو نہ صرف ادب عالیہ کی تخلیق ہوسکتی ہے بلکہ باطل کی زندگی، حق کی زندگی میں مبدل کیجاسکتی ہے ، غلامی کی زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے کیجا سکتی ہیں، آزادی کی نعمت کا صحیح استعمال کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ - میں نے پہلے ہی یہ بات عرض کردی ہے کہ

اقبال کی ''آرزو،، کو اکثر کلاسیکل شعراء کی گھٹیا قسم کی آرزو سے کوئی نسبت نہیں ۔ مزید برآں اقبال کی ''آرزو،، مبنی برحق و صداقت ہے ۔ اسے باطل افکار، اوہام اور اعمال سے بھی کوئی علاقہ نہیں ۔ اس نکتہ کو انہوں نے یوں واضح کیا ہے کہ ہر حسین و جمیل شے کو دیکھتے ہی آرزو ہماری رہنما اور (دلیل) بن جاتی ہے ۔ یہاں حسین سے مراد کلاسیکل شعرا کا معشوق مجازی نہیں بلکہ یہ حسن مترادف ہے صداقت کا اور صداقت ہم معنی ہے حسن کے ۔ ادب کو حسن کا دلدادہ ہونا چاہئے لیکن اسی معنی میں کہ ادب صداقت کا علمبردار ہوگا ۔ اب پھر دو اشعار ملاحظہ ہوں جن سے خیالات معروضہ پر روشنی پڑتی ہے :—

ہر چہ باشد خوب و زیبا و جمیل
در بیابان طلب ما را دلیل
حسن خلاق بہار آرزوست
جلوہ اش پروردگار آرزوست

لہذا کوئی مجھ سے اگر یہ سوال کرے کہ اقبال کے نظریہ' ادب کا Elan Vital کیا ہے تو میں اقبال ہی کی زبان میں یہ جواب دونگا کہ Elan Vital '' آرزو،، ہے ۔ یہی وہ داعیہ ہے جو '' حسن کی،، تلاش پر آمادہ کرتا ہے اور یہی وہ ''حسن،، ہے جو ادب کا ڈھانچہ اختیار کر لیتا ہے ۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ اقبال ان معنوں میں رومان پرور (Romantic) ادیب ہیں جن معنوں میں ہیگل، شاپن ھاور، فخٹے اور کیٹس وغیرھم کو رومان پرور کہا جاتا ہے ۔ اقبال کو ایسے حسن و جمال سے کوئی سروکار نہیں جہاں شعرا اور ادبا جمالیات کی بھول بھلیاں میں گم کردۂ راہ ہو جائیں ۔ اس لئے کہ حسن اور جمال صداقت کے مترادف ہیں اور صداقت وہ مشعل ہے جو زندگی کی اندھیری راتوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے ۔

اقبال کے مرلہ بالا خیالات کی تفہیم کیلئے مذکورہ باب کے ان اشعار کا جو ''گر خون انسان . . . . ،، سے شروع ہوکر ''. . . پروردگار آرزوست،، تک پھیلے ہوئے ہیں، بغور مطالعہ کرنا چاہئے ۔ اس کے بعد ہی شعراء کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں ۔ اس بند کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر ادنیٰ سے ادنیٰ اشیا میں بڑی حقیقت، حسن، جمال اور صداقتیں دیکھ لیتا ہے جنکو عام ناظرین در خور اعتنا بھی تصور نہیں کرتے ۔ ایک حقیقی شاعر پروانہ کا سوز اپنے دل میں، شمع کی جلن اپنے قلب میں اور بلبل کی فریاد اپنے وجود میں

محسوس کرتا ہے۔ اسکو گلوں میں بستیاں نظر آتی ہیں۔ خار میں ویرانے دکھائی دیتے ہیں۔ منھ بندھی کلیوں میں پابندیٔ گفتار کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شاعر کا کاروان تخئیل یہیں پر تھک کر بیٹھ نہیں جاتا۔ بلکہ وہ مسلسل آرزوئے سفر سے بیتاب ہوکر آمادۂ سفر ہوتا ہے۔ اقبال کے قول کے مطابق ایک حقیقی شاعر کا مرتبہ وہی ہے جو ''خضر راہ کا،، ہوتا ہے اور اسکی تخلیقات کی حیثیت ''آب حیات،، سے کسی درجہ کم نہیں۔ بہ الفاظ دیگر ایک حقیقی شاعر کی قوت تخئیل سے اسکی قوم میں (نیز عام انسانی برادری میں) عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور افراد کی زندگی میں وسعت کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لحظہ بہ لحظہ اور لمحہ بہ لمحہ ارتقا کے نئے نئے مراحل طے کرنے کیلئے کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ ان بیانات کی تائید کیلئے ''از دمش بلبل نوا آموخت است،، سے لیکر ''آتش خودرا چوں باد ارزاں کند،، تک کے اشعار کا بغائر مطالعہ ضروری ہے۔ میں چند غیر فانی اشعار کی نقل پر اکتفا کرتا ہوں :—

خضر و در ظلمات او آب حیات
زندہ تر از آب چشمش کائنات
از فریب او خود افزاء زندگی
خود حساب و ناشکیبا زندگی
اهل عالم را صلا بر خواں کند
آتش خود را چوں باد ارزاں کند

پہلے دو بند کا جائزہ ہم نے لے لیا ہے۔ اب تیسرا بند ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ بند اپنی نوعیت پیغام کے اعتبار سے منفی ہے لیکن سڑے گلے ادب پر تنقید کس اصول کے تحت کی جائے اسکا ملخص اسی بند میں ملتا ہے۔ بات کو اگر طول نہ دیا جائے اور مختصراً بات کہنے پر اگر ہم اکتفا کرسکیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ ادیب اور ہر وہ شاعر جو اپنی قوم کو اور عام انسانیت کو زندگی سے فرار کی تلقین کرتا ہے ناپسندیدہ اور نا محمود ہے۔ ایک لفاظ اور جھوٹے شاعر کا یہ بھی ایک بنیادی عیب ہے کہ وہ ''برائی،، کو ''بھلائی،، کے لباس میں پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو افیون دیتا ہے، اسکو ذوق عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ ایسا شاعر اس جل پری سے مشابہ ہے جس کے جسم کا نصف اول عورتوں جیسا ہوتا ہے اور نصف آخر کسی مچھلی جیسا۔ اسی جل پری کے نغموں سے جہاز ران بدمست ہوکر راستہ

بھول جاتے ھیں ۔ اقبال کے رمز، کنایہ اور تشبیہات کی طرح یہ جل پری کی تشبیہہ بھی معنویت کے خزانے سے مالا مال ہے ۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اس شعر کو اسی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ہر وہ شاعر جو اپنی مخصوص تہذیب میں پروان چڑھنے کے باوجود، اپنا نظام زندگی رکھنے کے باوجود، اپنی روحانی اور مادی اقدار رکھنے کے باوجود جب اپنی قوم کو دوسری تہذیب، دوسرے نظام زندگی اور دوسری اقدار کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ دراصل مذکورہ بالا جل پری کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ دراصل دو رنگی ہے — زندگی اور تخیلات کی دو رنگی ہے— جسکو اقبال کی وحدت فکر گوارا نہیں کرتی ۔ اب اس بند کے دو تین اشعار ملاحظہ ہوں : —

وائے قومے کز اجل گیرد برات
شاعرش و ابو سید از ذوق حیات
سست اعصاب تو از افیون او
زندگانی قیمت مضمون او
ماهی و از سینه تا سر آدم است
چون بنات آشیان اندریم است

آخری بند میں جہاں اقبال نے لفاظ اور جھوٹے شاعروں کے مکر و فریب سے مجتنب رہنے کی اپیل کی ہے اگر اس سے قطع نظر بھی کیا جائے تو اقبال کے نظریہ' ادب کے مثبت اور منفی پہلو کی تصویر انھی باتوں سے نکھر کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے جن پر اس مرحلہ تک ہم نے اپنی توجہ کو مرکوز رکھا تھا ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے اقبال کے نظریہ' ادب کا تقابلی مطالعہ شروع کیا جا سکتا ہے ۔ تقابلی جائزہ کیلئے ادب کی دو مشہور تحریکوں کا تنقیدی مطالعہ ضروری ہے ۔ ان میں سے ایک تحریک ''ادب برائے ادب،، اور دوسری ''ادب برائے زندگی،، کے نام سے موسوم ہیں ۔

''ادب برائے ادب،، کے پیغمبروں میں وھی ھیگل، شاپن ھاور، نطشے، کیٹس وغیرھم کا نام لیا جاتا ہےجنکا ذکر اس سے پہلے بھی اس مقالہ میں آچکا ہے ۔ اس اسکول کے نمائندوں کا خیال ہے کہ ادب ''جمالیات کا مظہر ہے،،، ادب ''حسن کا پرستار ہے،، اور ''ادب وہ لطیف تخلیق ہے جسکا دامن حقیقت مطلق سے وابستہ ہے،، ۔ اس طرح تعریفوں (Definitions) کا اگر بالاستعاب جائزہ لیا جائے تو ہمیں یہ بات معلوم ہو جائیگی کہ انکے شارح اکثر عینیت (Idealism) کے رسیا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ماورائیت

(Transcendentalism) بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اس ماورائیت کی بہتات کے سبب اگر کوئی دوسرا اسکول یہ کہے کہ ''ادب برائے ادب،، کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تو یہ دعویٰ اتنا ہی مہمل ہوگا جیسا کہ مارکس نے ہیگل کے Method پر تبصرہ کیا کہ یہ اپنے ''سر کے بل کھڑا تھا میں نے اسکو اسکے پیروں پر کھڑا کر دیا،،۔ ماورائیت ایک قسم کی زندگی ہے جو مجہول صوفیانہ اور جوگیانہ زندگی سے کسی قدر مشابہ ہے۔ اس لئے ایسے ادب کو جو ماورائیت کے لامکان میں تخیلات کے پر لگا کر پرواز کر رہا ہو زندگی سے عاری کہنا بالکلیہ صحیح نہیں۔ اگر تھوڑے سے تفکر سے کام لیا جائے تو ہمیں یہ بات معلوم ہو جائیگی کہ ''ادب برائے ادب،، کے حامی بھی زندگی سے محبت کرتے ہیں لیکن فرق زندگی اور زندگی کا ہے۔ اقبال کے نقطۂ نظر سے اس قسم کے شعرا ''ذوق حیات،، سے روگردانی کرتے ہیں نہ کہ حیات سے، انکے ''بوسے،، ''گل،، کی تازگی چرا لیتے ہیں نہ کہ ''گل،، ہی کو۔ اور ان کے نغمے ''بلبل،، کے دل سے ''ذوق پرواز،، کو محو کر دیتے ہیں نہ کہ ''خون بلبل،، کو۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ دنیا کے ہر دور کا ادب زندگی سے وابستہ تھا۔ زندگی اور ادب میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ البتہ ہر دور کا ادب اپنے زمانہ کے مخصوص طرز زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے جو مستقبل کی نسلوں کے نزدیک ناپسندیدہ تو ہوسکتا ہے لیکن جسکو زندگی سے بیگانہ کہنا سراسر زیادتی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی دور کا ادب زندگی سے بیگانہ نہیں رہا۔ البتہ جس دور میں حق کی طاقتیں مغلوب ہوگئیں تو اس دور کے ادب میں صالح زندگی کے نقوش بھی کجلا گئے۔ لہذا اپنے مدعا کی مزید وضاحت کیلئے میں یہ عرض کروں گا کہ ادب زندگی سے بیگانہ نہیں رہا بلکہ صالح زندگی سے بیگانہ رہا۔

''ادب برائے ادب،، (Art for the sake of art) کا ایک دوسرا تنقیدی پہلو بھی سامنے آنا چاہیئے۔ Art for the sake of art کو کبھی Form for the sake of form سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسکی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ 'فن برائے فن'، یا 'اسلوب برائے اسلوب'، کی تحریک ادب کے 'What'، سے بحث نہیں کرتی بلکہ 'How'، سے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس دنیائے رنگ و بو میں کوئی ایسا ادیب بھی گذرا ہے جس نے عام ناظرین یا سامعین سے یہ مطالبہ کیا ہو کہ ''تم میری تخلیق خالصتاً فن اور اسلوب کے لحاظ سے پرکھو اور یہ نہ دیکھو کہ میں نے کیا بات کہی ہے بلکہ یہ دیکھو کہ میں

نے بات کسطرح کہی ہے،،۔ کیا کیٹس نے کبھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''میری نظم Endymion کو محض فنی نقطہ نظر سے جانچو،،۔ کیا ٹینیسن نے یہ بات کسی سے کہی تھی کہ ''میری نظم Crossing the Bar کو اس نقطہ نظر سے نہ پڑھو کہ میں نے اسمیں کیا کہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ بحر کونسی ہے اور الفاظ کا توازن کس حد تک نغمگی پیدا کرتا ہے،،۔ کیا میر نے اپنے ''دل،، کو ''خون،، کرنے کے بعد اپنا دیوان اسی لئے آئندہ نسلوں کو عطا کیا ہے کہ ہم زبان کا چٹخارہ لینگے۔ کیا غالب، انیس، داغ اور امیر مینائی کے دعوے یہی تھے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر ان میں سے کوئی بھی ہستی زندہ ہوتی تو ہماری یاوہ گوئی پر جھنجھلا کر ہم سے الجھ پڑتی۔ ادب برائے ادب کے رہنماؤں میں سے کسی کا از خود یہ دعویٰ نہ تھا بلکہ دنیا بھر کے اشتراکی ادیبوں نے یہ اتہام انکے سر جبراً تھوپنے کی کوشش کی ہے۔[1] اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے فن اور اسلوب کی اہمیت پر زور دیا۔ اور کیوں زور نہ دیتے؟ ان کے ذمہ زبان کو سنوارنے اور بنانے کا ایک عظیم الشان فرض تھا۔ اسی فرض کی ادائیگی انکی منزل مقصود تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ زبان بگاڑنے کے درپے تھے۔ یہ تو آجکل کی نوجوان نسل ہے جسکی جدت طرازیوں نے زبان کو مہملات کا ایک پلندہ بنا دیا ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے اپنے ایک مقالے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب کو ''مواد کے لحاظ سے اجتماعی اور اسلوب کے اعتبار سے انفرادی ہونا چاہئے،، کم از کم صف اول کے ادیبوں کے ساتھ ہمیشہ یہی معاملہ رہا۔ ہر دور کے شہرت یافتہ ادیبوں نے یہی روش اختیار کی۔ ہم دانتے کو پسند کریں یا نا پسند لیکن اسکی ڈیوائن کامیڈی کا مواد اجتماعی ہے، یہ مواد اس زمانہ کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے اور اسکا اسلوب انفرادی ہے۔ ہم ملٹن کو سراہیں یا نہ سراہیں لیکن اسکی پیراڈائز لاسٹ کا مواد اجتماعی ہے اور اسلوب انفرادی۔ ہم میر کو چاہیں یا نہ چاہیں لیکن انکی شاعری کا مواد اجتماعی ہے اور اسلوب انفرادی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جیتے جی یا مرنے کے بعد کبھی بھی یہ شعرا اور ادیب غیر فانی تحسین

---

[1] ادب برائے ادب پر جو کچھ بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اسمیں ڈاکٹر اے۔ سی۔ بریڈلی (A. C. Bradley) کی تصنیف Lectures on Poetry سے استفادہ کیا گیا ہے۔

کے مستحق نہ ٹھہرے۔ اگر ادبا اور شعرا کی تصنیفات اور تخلیقات کا مواد اجتماعی اور اسلوب انفرادی نہ ہوتا تو از روئے منطق مواد انفرادی ٹھہرتا ہے۔ لیکن کیا ہم عمرانیات کے مبادی کو جھٹلا سکتے ہیں ؟ کیا ہم یہ کہنے کی جرأت رکھتے ہیں کہ ایسے ادیب خلاؤں میں پیدا ہوئے ہیں یا افلاطون کے اس Allegorical Cave میں مقید رہے ہیں جہاں کسی شے کا گذر نہیں ؟ ہمیں نہایت ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور و فکر کرنا چاہیئے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہم جب بھی کسی دور کے ادب کا اپنے دور کے ادب سے موازنہ کرینگے تو ہمیں مشکلات سے دوچار ہونا ہی پڑیگا اس لئے کہ ہر دونوں میں وقوع معنوی (Meaning Situations) کا فرق ہوگا۔ یہ فرق بنیادی بھی ہے اور اہم بھی اسکو تنقیدی مطالعہ کے وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اب میں ''ادب برائے زندگی،، کے نظریہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ یہ نظریہ اردو ادب میں نیا نیا داخل ہوا ہے۔ اسکی عمر تیس چالیس سال سے زیادہ نہیں۔ ہندی اور اردو کے مشہور مصنف اختر حسین رائے پوری نے اسی نظریہ کی بنیاد پر تنقید جدید کی داغ بیل ڈالی ہے۔ انکی تصنیف ''ادب اور انقلاب،، ''سنگ میل،، کا مقام حاصل کر چکی ہے۔ اس ادبی تحریک کے قائدین میں سید احتشام حسین اور مجنوں گورکھپوری کے نام سر فہرست آتے ہیں۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ ایک بدیشی تحریک ہے جسکو ہم نے اپنے دور انحطاط میں درآمد کیا ہے۔ لیکن اس اعتراض میں کوئی وزن اور جاذبیت نہیں اس لئے کہ دنیا ایک وحدت بن چکی ہے۔ ایک جغرافیائی وحدت — اور یہ تحریک عالمگیر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس لئے اس تحریک پر نقد و تبصرہ اسکے نظریہ اور پیغام کو سامنے رکھ کر ہی کرنا چاہیئے۔ میں اس نظریہ سے بحث کرتے وقت بالکل معروضی (Objective) طریق استدلال اختیار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں میرا پہلا اقدام یہ ہے کہ میں چند اقتباسات ہدیۂ نظر کرتا ہوں پھر انہی سے استنتاج کی سعی کرونگا۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں :—

> ''مضمون کے پہلے حصہ میں یہ دکھایا جائیگا کہ تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے۔ اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے،،[1] ''ساری زندگی ایک گت پر ناچ رہی ہے اور

---

1 ادب اور انقلاب از اختر حسین رائے پوری صفحہ نمبر ۵۱ ۔

وہ ہے ''روز کی روٹی، 'روز کی روٹی، کی گت،، ''..... خدا کی خدائی کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کر سکی جو بلا روٹی کے زیادہ عرصہ تک زندہ رہ سکے،، ۔2

''مادی وسائل کی تعداد اور خصوصیتیں تخیل کا ڈھانچہ بناتی ہیں اور فنکار انہی کی عکاسی کرکے زندگی کی قدروں کی تخلیق اپنے طور پر کرتا ہے،، ۔3

''انسان اپنی ترقی کی رفتار میں جس جگہ ایک دفعہ پہنچ جاتا ہے ٹھیک اسی جگہ پر پھر نہیں پہنچتا ۔ جو نظرئیے عزیز ہوتے ہیں وہ بدل جاتے ہیں ۔ جو باتیں ایک وقت میں تسکین دیتی ہیں دوسرے وقت میں وہی تکلیف دہ بن جاتی ہیں ۔ سائینس، آرٹ، مذہب اور جنسی تعلقات سب میں پیداوار اور پیداوار کی تقسیم کے بدلتے ہوئے تناسب نے فرق ڈالدیا ہے،، ۔4

''سوسائٹی طبقوں میں تقسیم ہوتی رہی اور انکی معرکہ آرائیوں میں ادب اور علم زیادہ تر طاقتور کی ذاتی ملکیت بنے رہے،، 5

محولہ بالا اقتباسات پر اگر ایک طائرانہ نظر بھی ڈالی جائے تو یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ ''ادب برائے زندگی،، کے علمبردار فکری اعتبار سے اشتراکیت کے ہمنوا اور ہم خیال ہیں ۔ انہوں نے ادب کا ڈھانچہ اور سانچہ ''اصول تغیر،، ، ''پیداواری تقسیم،، اور ''طبقہ وارانہ کشمکش،، کی بنیادوں پر تیار کیا ہے ۔ ان مصنفین کی، جنکے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، صاف گوئی لائق تحسین ہے ۔ یہ کم از کم اخلاقی جرأت کے لحاظ سے ان سے تو بہتر ہیں جو اشتراکیت پر بالفعل ایمان رکھنے کے باوجود اس سے انکار کرتے ہیں ۔ اسے ایک جملۂ معترضہ تصور کیا جائے ۔ ہمیں تو دراصل ان بنیادوں کا جائزہ لینا ہے جن پر ''ادب برائے زندگی،، کا انحصار ہے ۔

اصول تغیر کوئی نیا اصول نہیں ہے ۔ اسکی جھلک یونان کے **فلسفیوں**

---

2 نئی پرانی قدریں از مجنوں گورکھپوری ۔ سویرا صفحہ نمبر ۳۰ ۔

3 روایت اور بغاوت از سید احتشام حسین ایم ۔ اے صفحہ نمبر ۱۲۲ ۔

4 ایضاً صفحہ نمبر ۱۲۳ — نمبر 5 ایضاً صفحہ نمبر ۱۲۳ ۔

میں Heraclitus کے افکار میں ملتی ہے۔[1] وہ اسکا بڑی شدت سے قائل تھا۔ اسکا خیال تھا کہ ایک فرد کسی دریا میں دوسری بار غوطہ زن نہیں ہوسکتا اس لئے کہ وہ فرد بدل جائیگا، دریا بدل جائیگا نیز ماحول بھی بدل جائیگا۔ لیکن اسی کا جواب اسکے بعد ہی Zeno نے دیا۔ اور اس نے فلسفہ ثبات کو بڑی شدت سے پیش کیا۔ اس نے یہاں تک مبالغہ کیا کہ ایک تیر (Arrow) اپنے نقطہ آغاز پر ہی ساکت رہتا ہے اور وہ تیر حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ ہے اس اصول کا فکری پس منظر۔ مارکس کے دور میں بھی اصول تغیر کا چرچا کم نہ تھا اور برگساں کو دور حاضر کا Heraclitus کہا جاتا ہے۔[2] معاملہ کچھ بھی ہو۔ پس منظر اور پیش منظر کیا کچھ ہوسکتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اقبال کا نقطہ نظر کیا ہے۔ کیا اقبال اس خیال کے ہمنوا تھے کہ ''تقسیم پیداوار'' کے بدلتے ہوئے طریقوں کے ساتھ ساتھ ہمارا مذہب، آرٹ، علم اور فن سب کے سب بدل جاتے ہیں ؟ میرا یہ خیال ہے کہ اس اصول کا اثبات اور اسکو پھر اقبال کے سر تھوپنا ایک الزام اور ایک اتہام سے کسی طرح کم نہیں۔ اقبال کا تصور دین، دین اسلام سے لگاؤ، رسول عربی(ص) سے محبت، اسلامی اقدار کے احیاء کی لگن اور اسطرح کے دوسرے جذبات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اصول تغیر کے ان معنوں میں ہرگز قائل نہ تھے جن معنوں میں مارکس اور دوسرے اشتراکی مفکرین اسکے قائل نظر آتے ہیں۔ اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اقبال جس فلسفہ زمان (Time) کے پیرو ہیں اسمیں بھی ثبات ہی کا پہلو غالب ہے۔ البتہ اقبال جمود (خواہ انفرادی ہو یا ملی) کے نہ صرف مخالف بلکہ دشمن تھے۔ یہاں اسکا موقع نہیں کہ ہم اقبال کے فلسفہ کی تفصیلات میں جائیں۔ یہ تحصیل حاصل ہوگا۔ ایک شعر زیر نظر مذکورہ اصول کی تردید کیلئے کافی ہے۔ شعر بھی بہت بلیغ اور جامع ہے۔ شعر درج کرتا ہوں :-

زمانہ ایک، حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید

جیسا کہ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں اشتراکی مفکرین اور ادبا کا یہ ایمان ہے کہ ''پیداواری تقسیم'' ہی تخیل کے ڈھانچہ کی تشکیل

---

1 تاریخ فلسفہ از راجرس صفحہ ۲۲ -

2 تاریخ فلسفہ از راجرس صفحہ ۳۷۰ -

کرتی ہے ۔ اگر معاملہ یہی ہے تو پھر ایک ہی سوسائٹی میں مختلف النوع تخئیلات کہاں سے آئے ؟ ہم اپنی سوسائٹی ہی کو بطور مثال کیوں نہ لیں ۔ یہاں ''ترقی پسند مصنفین،، بھی ہیں ''اسلامی ادب،، کے حامی بھی ہیں، ''ادب برائے ادب،، کے ماننے والے بھی ہیں اور ایسے بھی افراد ہیں جو انمیں سے کچھ بھی نہیں ۔ یہاں ''دقیانوس،، بھی ہیں اور ''روشن خیال،، بھی، یہاں ''پرانے زمانہ کے لوگ،، بھی ہیں اور ''جدت پسند،، بھی ۔ یہاں مومن بھی ہیں اور کافر بھی، مشرک بھی ہیں اور ملحد بھی ۔ اتنے مختلف النوع گروہوں اور ذیلی گروہوں کے تخئیلات کے ڈھانچے ایک کیوں نہیں جبکہ پورے ملک میں اور پورے معاشرہ میں تقسیم پیداوار کا ایک ہی نظام کارفرما ہے ؟ ہمیں یہ اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ یہ اشتراکیت کی ایک نمایاں فکری لغزش ہے جسکو الفاظ کے حسین جامہ میں چھپایا تو جاسکتا ہے مگر جسکو حق بجانب ثابت کرنا ناممکن ہے ۔ اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ پیداواری تقسیم ہمارے تخئیلات کے ڈھانچہ کو استوار کرتی ہے تو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ انسان اس قسم کی قوت محرکہ کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی ہے ۔ مابعد الطبیعات کی زبان میں یہ کہنا پڑیگا کہ انسان اور انسانی معاشرہ مجبور محض ہیں ''جبریت،، پر ایمان لانا لازمی ہو جائیگا ۔ لیکن یہ اقبال کے فلسفہ ''خودی،، کے سراسر منافی ہے ۔ ''خودی،، کی سابق الذکر تین صفات میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ انسان ''ایک آزاد شخصیت کا امین ہے، جسے اسنے خود اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر قبول کیا،، ایک شعر بھی ملاحظہ ہو : —

چاہے تو بدل ڈالے ہئیت چمنستان کی
یہ ہستیٔ دانا ہے، بینا ہے توانا ہے

میں نے یہاں اشتراکی نظام فکر میں مادیت کے غلو آمیز پہلو کا علیحدہ طور پر ذکر نہیں کیا ۔ اس لئے کہ ''پیداواری تقسیم،، کا اصول خود ہی مادیت کی ٹھوس شکل ہے ۔ ''ترقی پسند ادیب،، دنیا کو ایک ہی گت پر تھرکتے ہوئے دیکھتے ہیں اور وہ گت ہے ''روز کی روٹی،، ''روز کی روٹی،، ۔ اقبال کو ''روز کی روٹی،، کے حصول کے جذبہ کا انکار نہیں ۔ وہ خود بھی ایک ایسے معاشی نظام کے داعی ہیں کہ جس کھیت سے دھقان کو روٹی میسر نہ ہوتی ہو وہ اسکے ہر ''خوشۂ گندم،، کو جلا دینا پسند کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو اسکی ترغیب دلاتے ہیں ۔ لیکن اسکے معنی یہ تو نہیں کہ وہ

''پیداواری تقسیم،، کے اس فساد عظیم کی کڑوی گولی کو بھی ہمارے حلق سے اتروانا چاہتے ہیں جو ''انفرادی،، یا ''جماعتی آمریت،، کی شکل میں رونما ہوتا ہے اور ریاست کے ایک ایک فرد کی ''خودی،، کو بے جان مشین کا کل پرزہ بنا دیتا ہے۔ اقبال اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اسی لئے وہ مارکس کو ''پیغمبر بے کتاب،، کہتے ہیں اور اشتراکیت کو ''مساوات شکم،، کی آئینہ دار ٹھہراتے ہیں۔

مذکورہ بالا دو بنیادوں کے علاوہ اشتراکی مفکرین نے ''طبقہ وارانہ کشمکش،، کی بنیاد پر بھی مبالغہ آمیز حاشیے چڑھائے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ تاریخ اقوام انہی کشمکش میں بنتی اور بگڑتی رہی ہیں۔ وہ یہ بھی خوش فہمی رکھتے ہیں کہ ایک زمانہ آئیگا جبکہ یہ کشمکش ختم ہو جائیگی اور ایک ایسی سوسائٹی جنم لے لیگی جس میں کوئی طبقہ موجود نہ ہوگا۔ یہ پرولتاری آمریت کی منتہائے مقصود ہوگی۔ لیکن اقبال نے کیا خوب کہا ہے :—

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

اشتراکیت کے فلسفۂ طبقہ ورانہ کشمکش کو اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ (Classless Society) کا تصور کسی طرح عینیت (Idealism) کی قرار سے کم نہیں۔ یہ ایک خیالی مفروضہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن اشتراکی ادیب ہر سماجی، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی مسائل کی توجیہہ طبقہ وارانہ کشمکش کی بنیاد پر کرنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ کچھ بھی ہو انہیں راسخ العقیدہ ماننا پڑیگا۔

اشتراکی نظریۂ ادب کا تجزیہ یہیں ختم کرتا ہوں۔ اسے مزید طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ مجھے ایک بات اور عرض کرنی ہے وہ یہ کہ اشتراکی بنیادوں پر تخلیق ادب کرنے والے ایک عرصۂ دراز سے اس برصغیر ہند و پاکستان میں ''ترقی پسند مصنفین،، کے نام سے اپنے مشن پر لگے ہوئے ہیں۔ ہرچند کچھ ''ترقی پسند مصنفین،، اپنے دامن کو اشتراکیت کے گریباں سے باندھنا پسند نہیں کرتے پھر بھی یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دونوں میں گہرا ربط اور لگاؤ ہے۔ اس لئے ''اشتراکی ادب،، ، ''ترقی پسند ادب،، یا ''ادب برائے زندگی،، کی حقیقی اور عملی خصوصیات کا مطالعہ کرنے

کیلئے ترقی پسند مصنفین کی تخلیقات ضروری بھی ہیں اور کافی بھی ۔ آپ ان کی چند ''معرکۃ الآرا،، تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی یہ محسوس کرلینگے کہ ان میں مذہب دشمنی، روحانی اقدار سے نفرت، اخلاقی ضابطوں سے بیزاری کا رحجان عام ہے ۔ یہ ان تخلیقات کا منفی پہلو ہے ۔ مثبت طور پر آپ دیکھیں گے کہ جنسی انار کی، عریانی، لذت کوشی، ''غربا پروری،، دولت دشمنی کے جذبات پر پورا زور بیانی صرف کیا گیا ہے ۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اقبال نے ''ہنروران ہند،، کے نام سے جو اشعار قلمبند کئے ہیں وہ بھرپور صداقت کے حامل ہیں ۔ کہتے ہیں : —

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر آن برہمنوں کا بیزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ تنقید ''ادب برائے ادب،، اور ''ادب برائے زندگی،، ، دونوں اسکولوں، کے فنکاروں کی غیر معمولی اکثریت پر چسپاں ہوتی ہے ۔ زیادہ سے زیادہ تناسب کا فرق ہوسکتا ہے ۔

کچھ دنوں تک ''ترقی پسند مصنفین،، نے اقبال سے اپنا رشتہ جوڑنے کی سعی و جہد کی تھی لیکن بعد میں ان پر انکے رویہ کی حقیقت منکشف ہوگئی ۔ اور وہ اس سے باز آگئے ۔ ممکن ہے اقبال کے اسلوب سے ترقی پسند مصنفین میں سے بعض ادیبوں نے استفادہ کی کوشش کی ہو لیکن ترقی پسند ادب کو اقبال کے افکار سے دور کا واسطہ بھی نہیں ۔ اقبال کا ادب روشنی کا ایک مینارہ ہے جسکی بلند ترین چوٹی کا نام ''آرزو،، ہے ۔ یہ ''آرزو،، آرزوئے خودی ہے ۔ خودی اس مینارہ کی بنیاد ہے ۔ اقبال کا ادب نہ صرف زندگی کا آئینہ دار ہے بلکہ اس کا رہنما بھی ہے ۔ اقبال زندگی کے تاریک دھندلکوں میں جھانک کر اسکی گمراہیوں کی تشخیص کرتے ہیں اور پھر صحیح رہنمائی کیلئے جا بجا اپنے اشعار کے دیپ جلا دیتے ہیں ۔ یہ دیپ وہ خون جگر سے منور کرتے

هیں ۔ اس لئے ان کے اشعار میں نہ صرف نغمگی اور غنائیت ہے بلکہ سوز و گداز بھی بدرجہ' اتم موجود ہے ۔ اقبال کو اپنے مقصد کا خیال تھا اس لئے وہ شعر و سخن کی محفل تفنن طبع کیلئے آراستہ کرنے کے الزام سے بری ہیں ۔ مندرجہ' ذیل شعر اسی جذبہ کی انتہاء گہرائیوں کا مظہر ہے :—

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

اقبال کے ادب اور نظریہ' ادب کو نہ تو ہم ''ادب برائے ادب،، کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی ''ادب برائے زندگی،،۔ اس کیلئے ایک نئے نام کی ضرورت ہے ۔ ایک ایسے نام کی ضرورت ہے جو اقبال کی مجموعی تخلیقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے منتخب کرنا چاہئے ۔ ''ادب برائے ادب،، اور '' ادب برائے زندگی ،، کی کیفیات (Connotations) متعین ہو چکی ہیں ۔ اب ہمارے حالات و کوائف کا مطالبہ یہ ہے کہ اقبال کے ادب اور نظریہ' ادب کی کیفیت (Connotation) کا تعین کیا جائے ۔ تاکہ دانشور طبقہ کو صحیح طور پر اس بات کا علم ہوسکے کہ اقبال کی تخلیقات میں انکی رہنمائی کیلئے کس حد تک قوت ہے اور انہیں مزید کیا کرنا ہے ۔